انقلاب اور نئی زندگی کا تصور ۱۹۴۸ کی عربی شاعری میں نمو پذیر ہونے لگا ہے۔ سلمیٰ نے اس کتاب میں عربوں کے نظریہ تنقید و ادب کا بہت ہی جامع مطالعہ کیا ہے اور مکمل وسعت علمی و انتقادی بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔[1]

متذکرہ بالا کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد باقر علوان نے سلمیٰ کی تنقیدی خدمات کا یوں اعتراف کیا ہے:

"ان کی کتاب کا پہلا حصہ ۱۹ویں صدی کے اوائل سے ۱۹۳۰ تک پوری عرب دنیا میں ہونے والی ثقافتی، شعری، عقلی اور علمی ارتقاء کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ سلمیٰ کا تجزیاتی انداز ممتاز اور اہم شعراء اور شعری تجربات میں ان کے حصے اور بعد کی نسل پر ان کے اثرات پر بہت عمدگی کے ساتھ روشنی ڈالتا ہے۔

دوسرے حصے میں انہیں شعری ہیئتی تجربات کے ساتھ رومانوی واپولو تحریک سے لے کر ۱۹۴۸ء تک کا جائزہ لیا گیا ہے، جو کہ شعری ہیئت، تکنیک، اور موضوع میں تبدیلی کا ایک بنیادی سوال ہے۔ یہ حصہ نئی شاعری کے ارتقاء اور ابتلاء کا خوبصورت اور بہتر تجزیہ ہے۔"[2]

سلمیٰ نے عربی شاعری کا ایک انتخاب (Anthology) اور مختصر کہانیوں کا ایک مجموعہ بھی ترتیب دیا ہے۔ اور ناولوں کا انگریزی ترجمہ کیا ہے[3]

---

[1] Issa J. Boullata "Review On Trends And Movements In Modern Arabic Poetry". The Muslim World London.

[2] M. Bakir Alwan" Review On Trends And Movements"
Middle East Journal (WASHINGTON) Winter 1980

[3] عربی شاعری کا انتخاب: Modern Arab Poetry کے عنوان سے نیویارک ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ کہانیوں کا مجموعہ Litterature of Modern Arabia ہے۔ انہوں نے اسمٰعیل حبیبی کے ایک ناول کا ترجمہ T. Gassick کے اشتراک سے The Secret Life (مطبوعہ نیویارک ۱۹۸۲ء) کے نام سے کیا ہے۔ یوسف القاعد کے ایک ناول کا ترجمہ War In The Land بھی انہوں نے کیا ہے۔

اور ان کا مجلّہ دیوان "العودة من النبع الحالم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے [1]۔

(۳) معاصر عرب نسائی بوطیقا کے منظر نامے پر جو چند اہم شخصیتیں ابھر کر آئی ہیں ان میں فدوی طوقان، نازک الملائکہ، عزیزہ ہارون کے ساتھ سلمیٰ الخضراء الجیوسی بھی ہیں جن میں سے ہر ایک کا نسائی شعری تجربے میں گراں قدر حصہ ہے۔ عرب میں آزادیٔ نسواں کی تحریک سے متاثر ہونے والی ان خواتین شاعرات و ادیبات کے باغی گروہ سے یہ بھی متعلق ہیں۔ جنہوں نے روایتی سماجی نظام کے حصار کو توڑ کر مردانہ بالادستی والے معاشرے کو چیلنج دیا اور معاصر سماجی و سیاسی حالات سے باخبر ایک جدید اور پڑھی لکھی عورت کو معاشرے میں پیش کیا۔ عربی شاعری کے "معشوقاؤں" کی بغاوت اور مردانہ روایت سے انحراف نے عربی شعر و ادب میں ایک خوشگوار باب کا اضافہ کیا ہے اور اس طبقہ نسواں کے داخلی باغیانہ جذبات و احساسات سے شاعری کو روشناس کیا۔ جن کے وجود سے کائنات میں رنگ ہے معاصر خواتین شاعرات نے عربی ادب کی نئی تشکیل و ارتقاء میں مردوں کے دوش بدوش حصّہ لیا ہے۔ بلکہ بعض خواتین شاعرات کا مقام و حصّہ تو شاعروں و ادیبوں سے بھی بلند ہے سلمیٰ کے دیوان کے نصف حصّہ میں نسوانی رویے اور احساسات پر مبنی شعر ملتے ہیں۔ اور ان میں انقلابی معروضیت کا احساس ہوتا ہے۔ وہ مردانہ تفوق والے معاشرے کو عورتوں کی آزادی کے لئے ایک چیلنج قرار دیتی ہیں۔ اس لئے اس سماجی جبر کے خلاف اپنے شعروں میں آواز بلند کرتی ہیں، ان کے یہاں استحصال نسواں اور حقوق سے محرومی کا مسئلہ ایک سوالیہ نشان بن کر ابھرتا ہے اور وہ باغیانہ آزادانہ شعور کی لے میں یہ شعر کہتی ہیں جو تمام عورتوں کے احساسات کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اوحید فی عینلک نار تضرم	یثوی ویطلب، یسنید ویستجیب ویحکم
اما باعینا فان الوجد لغز مبہم	وبحیرة النفس العمیقة موطنة [2]

---

[1] ان کا عربی دیوان بیروت سے شائع ہوا ہے۔ مگر مجھے نہ ملنے کی وجہ سے عربی مجلات میں شائع شدہ قصائد اور نظموں سے استفادہ کرنا پڑا ہے۔

[2] ناصر الدین الاسد، الشعر الحدیث فی فلسطین والاردن (القاہرہ [illegible]) ص [illegible]۔

تنہائی، اداسی، وحشت اور خاموشی آج کی شاعری کا مقدر ہے۔ خصوصاً یہ چیزیں صنف نازک کے ساتھ ہوں تو ان کا احساس اور شدید ہو جاتا ہے۔ سلمیٰ کے احساس تنہائی (Lonesomeness) کی مثال یہ اشعار ہیں:

ولاتت وحدك ، انت وحدك ، دون حراب البادة

والوحشة الصماء تغرق ليلك المر الطويل

دنياك مظلمة و ممتوم عليك ولوجها

فانسى طرح فى افق على دنيا قريبه

قلبى ! .... تيومك قصة عمقة ولم مستبك

متلهفا ترجو الحياة ... فلا بعثت اليوم حيا له

(۴) فدوی طوقان کے مقابلے میں سلمیٰ نے ہیئت اور مضمون دونوں ہی اعتبار سے زیادہ عمدہ سیاسی شعر کہے ہیں اور وہ سیاسی شعر کے مفہوم کو فدوی سے زیادہ بہتر انداز میں سمجھتی ہیں۔ اس کے باوصف کہ اس میں کبھی کبھی خطابت کا رنگ و آہنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ سلمیٰ کے چار قصیدے فداء، الصامدون، مرثیۃ الشہداء اور النار المحرقۃ خاص طور پر قومی و سیاسی مسائل سے متعلق ہیں۔

سلمیٰ کا عرب فدائین کے لئے لکھا ہوا قصیدہ "فداء"[۲] ان کی جدوجہد اور قوم پرستی کی راہ میں اپنی جان کی قربانی سے متعلق ہے۔ شاعرہ نے اس میں براہ راست "جاں بازوں" کے متعلق بحث نہیں کی ہے بلکہ قربانی کے اس جذبے اور روح کے بارے میں کی ہے جو ہر جانباز میں کارفرما ہے، اور یہی جذبہ انہیں سقوط و شکست کے بعد بھی تازہ دم اور بیدار کرتا ہے اور اس طرح جدوجہد کی یہ تحریک جاری رہتی ہے۔ اس قصیدے کے ان اشعار:

تبارکت الارض، ارض الجدود، وارض السنابل والاقحوان

وارض الاغال، وارض الزرايا، وارض السيالة والعنفوان

---

[۱] ناصر الدین الاسد، الشعر الحدیث فی فلسطین والاردن (القاہرہ - ۱۹۶۱) ص ۲۵۴۔

[۲] دیکھئے: حسین مجاد، عز الدین اسماعیل، الادب والنصوص" (مصر، ۱۹۷۸) ص ۱۷۱، ۷۷۔

من عرس هذا الهشيم المتوحش ... تفجر الكفاح المسلح

من الاصرار الغضب ودوی ثورة سطاه السدم اليحسرك

("فدائی")

میں شاعرہ نے جانبازوں کی زبانی سر زمین وطن کی خیر و برکت بیان کرتے ہوئے اس پر مسلسل ظلم و جبر ہونے کی وجہ سے ان میں جو کیفیت شجاعت، استقامت، اور سخت جدوجہد کی پیدا ہوتی ہے اسے بیان کیا۔ اور اپنے پیشرو خود دار عربوں کی راہ پر چل کر آرزو، جدوجہد، قربانی اور سرخ آزادی کا راستہ اپنایا ہے۔ اس قصیدے کے بقیہ اشعار یوں ہیں۔

- وحين يجن الغروب
- وتغفوا عاصير روحی كما تنفس الريح بعد الهبوب
- كما تخمد النار بعد الشبوب
- سيحتل تلك الذرا
- ويغزو القری
- فدائی جديد
- اخ من رفاق الكفاح العنيد

اس میں شاعرہ جدوجہد کے طویل سفر کی داستان ایک فدائی کی زبانی یوں بیان کرتی ہیں کہ جس طرح مجھے اپنا خاتمہ معلوم ہے اسی طرح اس راستے کی انتہاء کی بھی خبر ہے۔ جب میرا سفر ایک منزل تک پہونچکر ختم ہو جائے گا اور میرے دل میں بھڑکنے والا شعلۂ جوالہ بجھ جائے گا تو میرے دوستوں میں سے جدوجہد کی راہ پر گامزن ایک فدائی میری جگہ لے گا۔ اور نئے سرے سے سفر کا آغاز کرے گا۔ اور اس طویل و پرمشقت راستے میں غایت مقصود کی طرف اپنے قدم بڑھاتے ہوئے موت کا بھی بہادری کے ساتھ استقبال کرتے ہوئے اس کی پیشانی کو چوم لے گا، یہ سلسلہ چلتا رہے گا، اور جانباز قوم پر یہ حقیقت واضح ہو گی کہ عرب جانبازوں کا خون رائیگاں نہیں ہو رہا ہے، بلکہ وہ روشنا

کی کرن میں تبدیل ہوکر تاریک دل کو روشن کر رہا ہے، اور منزل مقصود کی طرف بڑھتے قدم کی رہنمائی کر رہا ہے ان کے خون سے آزادی کے بند راستے کھلیں گے، راستے کی مشکلات اور رکاوٹیں دور ہوں گی۔ اس کیفیت کا اظہار ان شعروں میں ہے:

وبین یدیہ ھدیۃ الرحیل

ویسدل جفن الظلام الکثیف

ویلتفت ثوب الفتاۃ المصری علی الساعدین

اس قصیدے کے اجزاء معنوی اعتبار سے باہم مربوط ہیں۔ اس کے باوصف کہ "فدائی" ایک بہادری کا موضوع ہے، جو گرمی اور شدتِ اظہار کا مقتضی ہے۔ مگر شاعرہ نے بہت ہی نرم انداز اور سنجیدہ انداز ولے میں اسے بیان کیا ہے، کیونکہ حقیقی جانباز بنیادی طور پر سخت مزاج نہیں ہوتا۔ عمومی زندگی میں وہ نرم دل انسان ہوتا ہے [1]

اس قصیدے کے بارے میں ممتاز مبصر و ناقد محمد کاظم جواد کا خیال ہے کہ "اس میں پرسکون شعری نغمہ ہے جبکہ موضوع کے تقاضے کے مطابق اس میں گرمی، شدت، اور زور ہونا چاہیئے تھا۔ اس میں گو کہ بسا اوقات شعری آواز کے فقدان کا احساس ہوتا ہے مگر کچھ ہی دیر تامل کے بعد قصیدے میں ایک عرب فدائی کی آواز سنائی پڑتی ہے۔ سلمیٰ کے اس قصیدے میں دیگر جدید قصائد کی طرح بعض ابیات میں نظم کی روح عام ہوگئی ہے اس طور پر وہ عام شعری فضا کے سیاق سے دور ہو گیا ہے جیسے شاعرہ کا یہ شعر ہے:

ذآب تعربد فی ارضنا وارسوا علی الشاطئ الافرس

دونوں مصرعوں کے درمیان کوئی ربط نظر نہیں آتا۔ اور نہ ہی معنوی اعتبار سے شاعر کا مقصد پورا ہوتا نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود قصیدہ خوب صورت منظر اور تصویر سے بھرپور ہے [2]

---

[1] حسین نصار و عز الدین اسماعیل، الادب والنصوص (مصر ۱۹۷۸) ص ۷۵

[2] محمد کاظم جواد، "نقد القصائد" مجلۃ الآداب۔ بیروت (یونیو ۱۹۵۶)

اسی طرح کے سیاسی نوع کا ایک اور قصیدہ "مرثیۃ الشہداء" ہے جس کے چند ابیات یوں ہیں:

هكذا ماتوا، ويمضي غيرهم نحو المصير
قد زممتومة روياك، يا جبل العطار

رمشة محمومة تجتاح قلبي وتثير
رمعة الحزن بعيني ودمعي الكبير

مندرجہ بالا ابیات جذباتی شدت اور بہاؤ لئے ہوئے ہیں۔ یہی کیفیت پورے دیوان پر محیط ہے۔ یہ "جبل العطار" کے المیے کی دردناک کہانی ہے۔ یہی وہ نسل ہے جو نہ اپنی خواہشات کو مکمل کر سکی اور نہ ہی آرزوؤں کو۔ اور بغیر کسی مستقبل کے اس دنیا سے گذر گئی۔ یہ جانبازوں کے لئے ایک پرزور مرثیہ ہے اور ان لوگوں کے لئے بھی جنہوں نے اپنے وطن کی خاطر اپنی جان تک دیدی۔ یہ صرف برسرپیکار نسل کا رزمیہ نہیں ہے بلکہ خوابوں کے زوال اور خوابیدہ چشمے سے تشنہ مراجعت کی ایک کہانی بھی ہے [۲] عرب ادنیا دو طرح کے غموں سے دوچار ہے، موت اور ہزیمت، معرکہ کا میدان لاشوں سے بھرا پڑا ہے، جن کا ان شہیدوں سے ایک طرح کا رشتہ ہے یا قربت نصیب ہے وہ موت کی خاموشی میں بہادروں کی یادوں اور کامیابی کے جذبات و احساسات کو محسوس کرتا ہے۔ اور جلد ہی اسکی انتقام، انقلاب کی چیخ و پکار کے ساتھ غم زدہ آواز بھی مل جاتی ہے۔

اسی قصیدے کے یہ چند ابیات:

انا ادري انهم ماتوا "ليحيا الوطن"
وطن القتلى، وحقل الدم هذا الوطن
انا ادري انها "الحرية الحمراء" من الثمن

---

[۱] تفصیل کے لئے، محی الدین صبحی: "الابطال المهزومون" الآداب بیروت (جلد نمبر ۰۰، ۱۹۷۰)

[۲] محی الدین صبحی: "الابطال المهزومون" الآداب بیروت (جلد نمبر ۰، ۱۹۶۰)

الرائع، المنحوس يا لاهات، هذا الشي
انادري! انما الحزن باعاق فاري ليس يدري
انا ابکی کل حین فقدت ضوء الحيا ة
کل روح سلامن بين الشغا ة !

یہ ان کے اسپارٹا کی اس روایت کی یاد دلاتے ہیں، جس میں وہاں کے باشندے دیوتاؤں کو اپنے بچوں کا خون بھینٹ چڑھاتے تھے جس سے قربانی کی ضرورت کا بھی احساس ہوتا ہے اور ساتھ ہی رنج والم بھی۔ انسان ان دونوں احساسات کا مجموعہ ہے یہی حقیقی قربانی ہے جس میں ایک انسان کو اس کا ادراک بھی ہے کہ قربانی کتنی عظیم اور اہمیت کی حامل ہے۔ اور ساتھ میں یہ احساس بھی کہ اس کی وجہ سے اس پر غمگینی اور حزینہ کیفیت بھی طاری ہو گی۔ مگر وہ بلند جذبات کے ساتھ مکمل رضامندی سے قربانی دیتا ہے اور ایک پوری نسل کا بوجھ اپنے کندھے پر اٹھاتا ہے [۱]

سلمٰی نے اس قصیدے میں یہ بات بھی کہی ہے کہ فلسطین میں ہر چیز معمول کے مطابق چل رہی تھی اور زندگی بہت پرسکون تھی مگر اچانک پناہ گزینی کے عذاب سے وہاں کے لوگ دوچار ہوئے تو شاعرہ بھی غمگین اور اداس ہو کر یہ کہہ اٹھیں:

... و فريق يزرع الخيرات فيها، و فريق
يقطف الخيرات والازهار منها والاغاني
كان بعض منهم يحتال في جني دماها
... يقوى الانسان ... كانوا بشرا كالاخرين"

غسان کنفانی کے بقول یہ ابیات ان مسائل کو پیش کرتے ہیں۔ جن کو جارج آرول (George Orwell) نے اپنے ناول ۱۹۸۴ میں پیش کئے ہیں۔ یہ کہکر ہم یہ جانتے ہیں یہ کیسے ہوا؟ لیکن یہ نہیں معلوم کہ کیوں کر ہوا؟ اس کو بہت ہی شدت اور جامعیت کے ساتھ "کانوا بشرا
(باقی صہ پر)

---

[۱] غسان کنفانی: "النبع الحالم۔ وحزن الهزيمة" مجلة الآداب، بيروت (المدنية ۱۹۶۰)

"کا الاخرین" کہکر سلمیٰ نے پیش کیا ہے۔ کہ آخر صرف الیسان ہی تک کیوں محدود رہے اور تکلیف کیوں برداشت کریں؟ ۱

شاعرہ کو اپنے خوبصورت دن یاد ہیں جب ہر چیز خیر و خوبی کے ساتھ گزرتی تھی۔ امن و سکون تھا۔ وہ بچپن کے یادگار دن تھے۔ جسے وہ کبھی بھلا نہیں سکتیں۔

کم تواددنا سفارا ۔۔ وتسابقنا مع النجم القریب

فشدنا فی الذری الخضراء فی العرش الخصیب

(لم ید رك كم كان خصيب)

مگر اچانک فلسطینیوں کو شکست ہوئی اور بے وطن فلسطینی اپنے سرحد کو پار کرتے ہی "پناہ گزینوں" کے لقب سے پکارے جانے لگے۔ یہ حادثہ ان کے لئے روح فرسا تھا۔ اس احساس کی تصویر کشی سلمیٰ اس طرح کرتی ہے۔

وسالت البر والبحر علیهم ـــ وشعوب الفجر والليل الحزين

فهدتنی نجمة مطفأة العين اليهم ـــ وبقايا الوسخ المحول من فيائهم

يوم خافوا الموت في اوطانهم ـــ كي يعيشوا ... لاجئين

سلمیٰ نے فلسطینی پناہ گزینوں کے متعلق ایک انتہائی خوبصورت اور عمدہ نظم "بلا جذور" کے عنوان سے لکھی ہے، جو منفرد و منتشر خاندان کی المیاتی صورت حال کی ایک صحیح مثال ہے۔ یہ نظم اجنبیت و بیگانگی (Alienation) روح فرسا مصیبت اور پناہ گزینوں کی بڑھتی ہوئی خفگی کی تصویر پیش کرتی ہے۔ سلمیٰ نے اس میں بکھراؤ اور انتشار کے کرب کو پیش کیا ہے۔ اور اپنی عرب شناخت کے کھو جانے پر افسوس کا اظہار بھی۔ اس نظم کا مجموعی تاثر انتہائی گہرا ہے کیونکہ اس نے پناہ گزینوں کی بے چینی کی تصویر ان عربوں کی زبان کھینچی ہے جو بہت ہی مسرور و مطمئن ہیں۔ سلمیٰ نے قومی ضمیر کو ایک زندہ آواز کی حیثیت دی ہے۔ اور مطمئن اور پناہ گزینوں کی قرابت اور خون کے رشتے پر وہ زور ڈال کر ان کے ضمیر کو للکار رہی ہے۔

(باقی آئندہ)

---

۱ غسان کنفانی: "النبع الحالم۔ وحزن الهزيمة"، مجلة الآداب، بيروت (يونيو ۱۹۷۰)

قسط نمبر ۱

مولانا آزاد کے تعلیمی خیالات

مختار احمد مکی، جمشید پور (بہار)

پروفیسر ہمایوں کبیر نے اپنی کتاب ـــــ Education In New India جو کہ پہلی بار ۱۹۵۶ء میں لندن سے شائع ہوئی، مولانا آزاد کے نام منسوب کیا ہے اس جملہ کے ساتھ کہ "وہ جنھوں نے ٹیگور اور گاندھی کے ساتھ ہندوستان کے لئے ایک قومی نظام کی تشکیل میں مدد دی" خواجہ غلام السیدین کا بھی یہی خیال تھا کہ مولانا فطرتاً سیاستداں نہیں تھے بلکہ ٹیگور گاندھی اور نہرو کی طرح ایک معلم تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد صحیح معنوں میں ماہر تعلیم یا معلم تھے یا نہیں اختلاف کا موضوع رہا ہے مولانا عبدالماجد دریابادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین انہیں اصطلاحی معنوں میں فلسفی یا ماہر تعلیم تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں ان کے خیال میں مولانا آزاد کے تعلیمی فلسفہ یا تعلیمی تصور کا تصور ہی سرے سے غلط ہے اور ان کے سرکاری عہدہ وزیر تعلیمات سے دھوکہ کھانے کی ضرورت نہیں جبکہ خواجہ غلام السیدین نے اپنے ایک مضمون میں معلم اور ماہر تعلیم کو دو معنوں میں استعمال کیا ہے ایک تو وہ جو تعلیم کے اصولوں اور نظریوں کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں اور تعلیمی اداروں میں اس کا عملی تجربہ کرتے ہیں جنہیں تعلیم کا فنی ماہر سمجھا جاتا ہے جبکہ دوسرے وہ لوگ جنہیں قدرت کی جانب سے ایک خلاق ذہن عطا کیا گیا ہے جو فلسفہ مذہب سیاست میں گہری نظر رکھتے ہیں جو جانتے ہیں کہ دنیا میں انسان کا کیا مقام ہے اور جن کی انگلیاں انسان کی زندگی اور اس کے نبض پر رہتی ہیں یہ لوگ زندگی کو نئی قدروں اور معنوں سے روشناس کراتے ہیں اور تعلیم کو ان کے حصول کا ایک ذریعہ بنانا چاہتے ہیں ان کے ذہن میں